(۷) ہندوستان میں مختلف مذاہب کا درس و مطالعہ موجودہ زمانہ میں :-

(الف) جین مذہب :- ڈاکٹر ڈی - ملوا نیا ڈائرکٹر ال - ڈی انسٹیٹیوٹ آف انڈولوجی احمد آباد

(ب) بودھ مذہب :- ڈاکٹر آر سی پانڈے - پروفیسر بودھیات دہلی یونیورسٹی

(ج) ہندو پاک میں اسلامیات کا درس و تحقیق :- سعید احمد اکبر آبادی

(د) ہندو مذہب کا مطالعہ اور ریسرچ :- ڈاکٹر کے - شیورامن بنارس ہندو یونیورسٹی -

(ھ) سکھ مذہب کا مطالعہ اور ریسرچ :- پروفیسر ہربنس سنگھ پنجابی یونیورسٹی -

(و) مسیحی مذہب :- ڈاکٹر کاج باگو

(ز) غیر ہندوستانی مذاہب میں ہندو اسٹڈیز : پروفیسر بیجاریہ ڈائرکٹر ریسرچ ڈپارٹمنٹ گاندھی پیس فاؤنڈیشن - نئی دہلی -

(ح) مولانا آزاد کا نقطۂ نظر مذاہب عالم کے متعلق : ڈاکٹر مشیر الحق پٹیالہ پنجابی یونیورسٹی -

(ط) ہندو عقیدہ اور زندگی کے متعلق مسیحیوں کا مطالعہ :- ڈاکٹر جون - ٹی - جیسیتی تھم - بنگلور

(۸) دنیا کے موجودہ حالات کے پیش نظر یونیورسٹیوں میں مذاہب کی تعلیم :- پروفیسر ولفریڈ اسمتھ - ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ،

یہ سب مقالات نہایت پُر مغز - مدلل اور پُر از معلومات تھے - ان سے مختلف مذاہب کے مطالعہ و تحقیق اور ان میں جدید رجحانات کے متعلق جو معلومات چار دن میں حاصل ہوگئیں اگر کوئی اس کو ہی موضوع بنا کر ایک برس مطالعہ کرتا تب بھی اتنی معلومات حاصل نہیں ہو سکتی تھیں اور اس طرح کے سیمینار کا یہی سب سے بڑا فائدہ ہے اور اسی وجہ سے امریکہ اور یورپ وغیرہ میں یہ بہت مقبول اور رائج ہے - ہر مقالہ کے بعد اُس پر بحث و گفتگو اور سوال و جواب ہوتا تھا اور اُس سے موضوع مقالہ کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر روشنی پڑتی تھی میں نے اپنے مقالہ میں صرف اُن کوششوں کا جائزہ لیا تھا جو تقسیم کے بعد سے اب تک انڈو پاک میں اسلامیات کی تعلیم اور ان پر ریسرچ کے سلسلہ میں ہوئی ہیں - لیکن سیمینار میں بیٹھ کر میں نے محسوس کیا کہ یہ مقالہ تشنہ ہے کیونکہ میں نے اس میں جدید رجحانات کا ذکر اور اُن پر تبصرہ نہیں کیا تھا - اس بنا پر جب میری باری آئی تو جناب صدر کی اجازت

میں نے ایک زبانی تقریر کی۔ مقالہ سائیکلو اسٹائل کیا ہوا ہر ایک کے پاس موجود تھا ہی اس لئے میں نے چار پانچ منٹ میں پہلے مقالہ کا خلاصہ بیان کیا اور اس کے بعد رجحانات پر تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ رجحانات تین قسم کے ہیں:

(۱) قدامت پرستی ( ORTHODOXY )

(۲) ترقی پسندی ( PROGRESSIVENESS. )

(۳) آزاد فکری ( LIBERALISM )

اول الذکر کی خصوصیت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کا خواہ کوئی مسئلہ و معاملہ ہو بہر حال اُس کا حل کسی ایک خاص فقہی مسلک کی روشنی میں ہی تلاش کیا جائے اور سرمو اس سے انحراف روا نہ رکھا جائے۔ اس کے بالمقابل ترقی پسندی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصل قانون قرآن و حدیث میں ہے اور فقہی مسالک کی حیثیت اس قانون کی تشریح و توضیح کی ہے وہ بجائے خود قانون نہیں ہیں۔ اس بنا پر کسی جدید مسئلہ کا حل اولاً براہِ راست قرآن و حدیث میں دیکھنا چاہیے اور اس کے بعد فقہ سے وہی کام لینا چاہیے جو عدالت میں بحث کرتے وقت ایک وکیل نظائر سے لیتا ہے۔ اب تیسرا رجحان: اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف قرآن کو ماخذ تسلیم کرتا ہے اور حدیث کو حجت نہیں مانتا۔ پھر اپنے لئے قرآن کی آزاد اور بے قید و بند تفسیر و توضیح کا حق بھی مانتا ہے۔
میں نے کہا کہ میرا تعلق دوسرے طبقہ سے ہے اور یہی رجحان میرے نزدیک صحیح ہے۔

سیمینار میں مقالات پر جو بحث و گفتگو ہوئی اُس سے یہ بات تو صاف طور پر واضح تھی کہ مذاہب کے مطالعہ کی اہمیت اور ضرورت سب تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ بحث و گفتگو زیادہ تر اس پر رہی کہ

(۱) ایجوکیشن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں "مذہبی تعلیم (Religious education)" اور "مذہب کی تعلیم (Education of Religion)" میں فرق کیا ہے اور اگرچہ اول الذکر کو سکولرزم کے خلاف بتایا ہے۔ لیکن موخر الذکر کی اہمیت اور ضرورت کو مانا ہے اور اس کو سکولرزم کے خلاف نہیں قرار نہیں دیا۔

(۲) کمیشن کی اس رپورٹ کی روشنی میں کیا سیکولر یونیورسٹیوں میں "مذہبی تعلیم" کا انتظام کرنا بھی

مناسب ہوگا ؟

(۳) فلسفہ تاریخ ۔ سنسکرت اور عربی وغیرہ جیسے مضامین کے ماتحت مذہب کی جو تعلیم ہوتی ہے وہ کافی ہے یا اس کے لئے یونیورسٹیوں میں مستقل کوئی انتظام ہونا چاہیئے ؟

یوں تو ہر مقالہ پر بحث کے دوران میں بہت سی باتیں زیر گفتگو آئیں جس میں میں نے بھی حصہ لیا لیکن لوٹ لوٹ کر اصل بحث انھیں تین مذکورہ بالا نقاط پر آجاتی تھی ۔ اس سلسلہ میں بعض اصحاب کی رائے یہ تھی ۔ اور شملہ والے ڈاکٹر تہار رحمٰن رے سب سے پیش پیش تھے سکھ مذہبی اور روحانی تعلیم کا شعبہ الگ نہیں ہونا چاہئے ۔ لیکن اکثریت اس کے خلاف تھی ۔ بہرحال مذاہب کی تعلیم (Comparative Religions.) اور اُس کے لئے حسب استطاعت و موقع مستقل شعبوں کے قیام کی ضرورت پر سب کا اتفاق تھا، چنانچہ ۸ ستمبر کی نشست میں جو صرف صبح گاہی تھی پروفیسر اسمتھ کے مقالہ کے بعد سیمینار کی طرف سے ایک متفقہ بیان اسی مضمون کا اشاعت کے لئے منظور کیا گیا ۔ اور اس کے بعد جانبین کی طرف سے اظہار شکریہ کی رسمی کارروائی کے بعد بارہ بجے سیمینار ختم ہوگیا ۔

**میرا پبلک لکچر** سیمینار کے علاوہ اس کے بانیوں نے ڈاکٹر مہادیون بنارس یونیورسٹی ۔ ڈاکٹر حسن عسکری عثمانیہ یونیورسٹی اور خاکسار راقم الحروف ہم تین اشخاص کے ایک ایک پبلک لکچر کا بھی انتظام کیا تھا اور اس کی منظوری پہلے ہی لے لی تھی ۔ میرے لکچر کا موضوع تھا "The concept of Din in the Quran." (قرآن میں دین کا تصور) یہ لکچر ۷ ستمبر کو شام کے چھ بجے یونائیٹڈ تھیالوجیکل کالج کے عظیم الشان اور وسیع ہال میں ڈاکٹر کے ۔ وی ۔ سری دہرن کی صدارت میں شروع ہوا اور ۷ بجکر دس منٹ پر ختم ہوا ۔ ہال امریکن، یورپین اور ہندوستانی مردوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا ۔ ہمارے سیمینار کے شرکا ہندو اور مسلمان بھی تھے لیکن غالب اکثریت عیسائیوں کی تھی ۔ سیمینار کی طرح لکچر کی زبان بھی انگریزی تھی اور بجائے مقالہ کے زبانی تقریر : اس لکچر میں میں نے لکچر کی دعوت پر رسمی شکریہ ادا کرنے کے بعد حسب ذیل امور پر گفتگو کی :-

(۱) دین کے لفظ کی اصل :- میں نے بتایا کہ یہ لفظ خالص عربی ہے اور اُن مستشرقین کی لسانیاتی اصول کی روشنی میں مدلل تردید کی جو کہتے ہیں کہ دین دراصل پہلوی یا سیرین زبان کا لفظ ہے اور زردشت نے اسے استعمال

کیا ہے۔ پروفیسر اسمتھ میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان مستشرقین میں میں نے ان کا نام بھی لیا۔

(۲) دین کے معنی اور تعریف: بعض مستشرقین اور ان کے تتبع میں ڈاکٹر جواد علی نے تاریخ العرب قبل الاسلام میں لکھا ہے کہ دین بمعنی مذہب کی تعریف ناممکن ہے کیوں کہ مذہب ( Religion ) کی قسمیں اتنی اور اس قدر متنوع ہیں کہ اُن میں کسی چیز کو ما بہ الاشتراک قرار دینا ممکن نہیں ہے۔ میں نے اس کا ذکر کر کے کہا کہ یہ رائے صحیح ہو یا غلط۔ بہرحال قرآن میں دین کا تصور بہت واضح اور صاف ہے۔

(۳) دین کا قرآن میں تصور:۔ وہ یہ ہے کہ دین اسلام ہے۔ یعنی اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینا۔ اُس کو ایک ماننا اور اُس کی اطاعت کرنا۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ یہ دین حضرت آدم کے زمانہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی رہا ہے۔ یہ دین خدا کا دین ہے کسی خاص پیغمبر یا نبی کا نہیں۔ اسی وجہ سے قرآن میں نہ دین کی جمع ادیان کہیں آئی ہے اور نہ اس کو کسی پیغمبر کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ مثلاً دینِ موسیٰ، دینِ عیسیٰ یا دینِ محمد وغیرہ[۵]۔

(۴) شریعت:۔ لیکن دین ایک کلی طبعی ہے جس کا وجود صرف ذہن میں ہوتا ہے اور خارج میں اُس کا تحقق افراد کی شکل میں ہوتا ہے۔ اسی طرح دین کا وجود خارجی شریعت کی شکل و صورت میں ہوتا ہے، لیکن دونوں میں رابطہ ایسا قوی ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح جسم و روح میں اتصال باقی نہ رہے تو زندگی باقی نہیں رہتی۔

(۵) شرائع اور مناہج کا اختلاف:۔ لیکن چونکہ شریعت میں احوال زمان و مکان اور قوموں کے طبائع کا لحاظ ہوتا ہے۔ جو بدلتے رہتے ہیں اس بنا پر شریعت میں اختلاف کا ہونا ناگزیر ہے۔

(۶) حاصل:۔ اب قرآن کہتا ہے کہ جب دین ایک ہے اور وہی ایک روح ہے جو وقتاً فوقتاً حسب ضرورت و موقع شریعت کے مختلف پیکروں میں ظاہر ہوتی رہی ہے تو پھر تم لوگ دین کو کسی ایک شریعت کے پیکر میں محدود و مقید کر کے اللہ کے دین میں کیوں تفریق پیدا کرتے ہو۔ تم اگر واقعی اللہ کے اطاعت گذار ہو یعنی مسلم

---

[۵] اسی بناء پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شاہ ولی اللہ الدہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں وحدۃ الادیان کے الفاظ کیوں استعمال کئے ہیں۔

ہو تو تمھارا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ دین کا ظہور جس شریعت کے پیکر میں بھی ہو تم اُس کو بے چون و چرا مانتے اور اُس پر عمل کرتے چلے جاؤ۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر سابق پیغمبر لاحق کی آمد کی اطلاع اور اپنے ماننے والوں کو اس کی اطاعت کا حکم دیتا رہا ہے۔

قرآن مجید سے ان تمام نقاط بحث کو مدلل و مبرہن کرنے کے بعد میں نے شریعت محمدی کی بنیادی خصوصیات عالمگیری۔ انسانی وحدت و مساوات اور عدل اجتماعی پر گفتگو کی اور آخر میں مَیں نے کہا :۔ خواتین و حضرات میں جانتا ہوں کہ میرے اس لکچر کو سن کر آپ میرا مذہب قبول نہیں کریں گے لیکن جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اُس سے کم از کم آپ حضرات کو یہ تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ قرآن کا تصور دین کس درجہ واضح۔ مکمل اور سائنٹفک ہے اور دوسرے پیغمبروں اور اُن کی لائی ہوئی کتابوں کے متعلق ہمارے دلوں میں کس قسم کا جذبۂ عقیدت و ارادت پیدا کرتا

لکچر کے ختم ہونے پر جناب صدر کے تحسینی کلمات اور کالج کے پرنسپل کے رسمی شکریہ کے بعد جب میٹنگ برخاست ہوئی اور میں ہال سے باہر آرہا تھا تو محترم بشپ آگے بڑھے۔ مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا اور فرمایا "میں آپ کی تقریر سن کر خوش ہوا ہوں" دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر یوسف الدین (عثمانیہ یونیورسٹی) سے ملاقات ہوئی لکچر کی بڑی داد دی اور فرمایا "ہال میں ایک عیسائی میرے پاس بیٹھے تھے وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ اکبر آبادی جو کچھ کہہ رہے ہیں کیا سب مسلمان بھی اسے مانتے ہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے کہا "میں نے جواب دیا "آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟ آپ تو صرف یہ دیکھئے کہ اکبر آبادی جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ قرآن سے ہے یا نہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ من و عن قرآن کے مطابق اور اس پر مبنی ہے" عثمانیہ یونیورسٹی سے سیمینار میں شرکت کے لئے ایک اور نوجوان ڈاکٹر محمد مرتضیٰ صدیقی آئے تھے۔ انھوں نے غالباً کوئی مقالہ تو نہیں پڑھا البتہ بحث و مذاکرہ میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ بہر حال بڑے لائق و فاضل ہیں اسلام پر امریکہ اور یورپ میں لکچر دے چکے ہیں اور ساتھ ہی نماز روزہ کے پابند بڑے دیندار اور جوشیلے مسلمان ہیں دوسرے دن ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بے حد تعریف کی اور بولے " حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے تصور دین کو اس سے زیادہ جامعیت اور بلاغت کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ رات تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔ یوں تو داد اور بھی مسلم اور غیر مسلم حضرات نے دی۔ لیکن میں نے "عثمانی برادرز کا ذکر صرف اس غرض

ے کیا ہے کہ یہ دونوں حضرات اسلامیات کے فاضل اور ڈاکٹر ہیں اور ساتھ ہی نہایت راسخ العقیدہ ور سچے مسلمان! دوسرے دن مقامی انگریزی روزنامہ دکن ہیرالڈ نے اس لکچر کا خلاصہ ایک کالم میں شائع کیا۔

بنگلور میں مزید قیام | ۸ ستمبر کو بارہ بجے دوپہر سیمینار ختم ہوا اور احباب اور رفقار واپس ہونے لگے۔ لیکن چونکہ یرا ادھر کا پہلا سفر تھا اس لئے میں نے میسور اور مدراس دیکھنے کی غرض سے مزید پانچ روز کا اور پروگرام بنالیا تھا اور اسی کے مطابق ڈاکٹر بارگو نے ہوائی جہاز میں رزرویشن کرادیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ سیمینار ایک خاص علقہ میں شہر سے الگ تھلگ ہوا ہے اس لئے کسی مسلمان کو میرے آنے کی کیا اطلاع ہوگی میں تن تنہا ریل یا بس کے ذریعہ میسور جاؤں گا اور الٹا سیدھا اسے دیکھ کر بنگلور واپس آ مدراس چل دوں گا۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ۷ ستمبر والے میرے پبلک لکچر کا دعوت نامہ کالجوں میں تقسیم ہوا تو اس سے ان کالجوں کے مسلم اساتذہ کو اور ان کی وجہ سے شہر کے حضرات کو میری آمد کی اطلاع ہوگئی۔ چنانچہ ۶ ستمبر کی شام کو میں ہوٹل کے ڈائننگ ہال سے ڈنر کھا کر نکل رہا تھا کہ دیکھا پانچ اصحاب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ علیک سلیک اور تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ امیر الوفد بنگلور کی جماعت اسلامی کے امیر مولانا سید جمال احمد امین آبادی تھے اور ان کے رفقا یہ حضرات تھے:

(۱) جناب یوسف شریف صاحب کنٹریکٹر

(۲) مسٹر خالد عرفان ایم۔ ایس سی۔ ایک مقامی مشن کالج میں کیمسٹری کے لکچرر ہیں لیکن اُردو زبان کے شاعر اور ادیب و نقاد بھی ہیں انگریزی اور اُردو دونوں میں لکھتے ہیں اور معیاری رسالوں میں ان کے مضامین چھپتے ہیں۔

(۳) جناب مشتاق احمد صاحب بی۔ ایس سی۔ بی۔ ایل اکاؤنٹ اسسٹنٹ۔

(۴) جناب نذیر احمد صاحب بی۔ ایس سی ایک سرکاری ادارہ میں آفس سپرنٹنڈنٹ۔

انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک کلچر کے زیر انتظام میری تقریر | مزاج پرسی اور ادھر اُدھر کی گفتگو کے بعد ان حضرات نے کہا کہ انھوں نے انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک کلچر کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے اور وہ اُس

کے ماتحت مسلمانوں کے ایک عام اجتماع میں میری تقریر کرانا چاہتے ہیں۔ میں نے بس وپیش اور اپنی عدیم الفرصتی کا عذر کیا۔ یوسف شریف صاحب نے کہا کہ آپ ۹ر کی صبح کو میسور جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اگر تنہا ریل سے یا بس سے گئے تو تکلیف ہوگی اور تنہا دیکھیں گے بھی کیا۔ اس لئے میں آپ کے لئے کار کا انتظام کر دوں گا۔ ۹ر کی صبح کو آپ کار سے میسور چلئے اور ۸ر اور ۹ر کی درمیانی شب میں ہمارے ہاں تقریر کیجئے۔ یوسف صاحب نے یہ موقت پیشکش ایسی کی کہ میں رضامند ہو گیا۔ چنانچہ دوسرے دن ہی یعنی ۷ر ستمبر کو بڑے بڑے پوسٹروں کے ذریعہ جلسہ کا اعلان کر دیا گیا اور خود ان حضرات کی تجویز اور خواہش کے مطابق تقریر کا عنوان "ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل" مقرر ہوا۔ اس کے بعد ۸ر ستمبر کو جب دن کے بارہ بجے سیمینار اور وہاں کی مہمانی دونوں ختم ہو گئے تو حسب قرارداد مولانا جمال احمد کو مستثنیٰ کر کے باقی چاروں اصحاب تین بجے کے قریب شیلٹن ہوٹل پہنچے اور میں اپنا سامان لے ان کے ساتھ ایک ٹیکسی میں روانہ ہو گیا پہلے بنگلور کا عظیم الشان اسمبلی اور کونسل ہال اور سکریٹریٹ دیکھا پھر لال باغ کی سیر کی، کمرشل اسٹریٹ میں گھومے ایک مسجد میں نماز عصر ادا کر کے ایک ہوٹل میں چائے پی اور آخر مغرب کے وقت کنگ ہوٹل میں۔ ایک کمرہ لے کر میں اس میں فروکش ہو گیا۔ اس ہوٹل کے سامنے ہی ایک بڑی وسیع اور کشادہ مسجد ہے (شاید جامع مسجد یہی ہو) اس میں نو بجے جلسہ شروع ہوا۔ پہلے ڈاکٹر یوسف الدین اور ڈاکٹر محمد مرتضیٰ صدیقی نے مختصر مختصر تقریریں کیں۔ ان دونوں حضرات کو دس بجے کی ٹرین سے حیدر آباد لوٹنا تھا۔ دس بجے میری تقریر شروع ہوئی جو پونے بارہ بجے ختم ہوئی۔ بنگلور کے مسلمان اُردو خوب بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اس زبان کے تین روزنامے بھی یہاں سے شائع ہوتے ہیں۔ اس لئے تقریر اُردو میں ہوئی۔ مسجد کا اندرونی حصہ بالکل بھرا ہوا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے آواز دور دور جا رہی تھی۔ اس لئے مسجد کے صحن میں اور بازار میں دکانوں پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے سن رہے تھے۔ دو تین نوجوان جو میرے سامنے بیٹھے تھے میں نے دیکھا کہ وہ نوٹ بھی لے رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ مجمع میں عوام کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ اور علماء اور خواص کا ایک بڑا طبقہ بھی شروع سے آخر تک شریک رہا۔

یہ تقریر جس کے لئے دن بھر گھومتے پھرتے رہنے کی وجہ سے میں کچھ سوچ بھی نہیں سکا تھا بالکل توکلاً علی اللہ ہوئی اور میں نے اس میں پہلے اس پر سخت اظہار افسوس و تشویش کیا کہ بیس برس گذرنے پر بھی ہمارا ملک

اس قابل نہیں ہوا ہے کہ اس کی ایک عظیم اقلیت اپنے مستقبل کے بارہ میں مطمئن اور خود اعتماد ہو سکے۔ اس کے بعد فلسفۂ تاریخ اور فلسفۂ اخلاق کی روشنی میں اُن صلاحیتوں، قوتوں اور اوصاف وکمالات پر گفتگو کی جن کی وجہ سے قومیں حضیض پستی وادبار سے اٹھ کر اوج اقبال وعروج پر پہنچ جاتی ہیں اور پھر عرض کیا کہ اسلام انسان کی ان صلاحیتوں اور قوتوں کی تہذیب وتربیت کر کے اسے کس طرح اصلح (The fittest) بنا کر اس لائق بنا دیتا ہے کہ وہ تنازع للبقا کے میدان میں اپنے لئے ایک باعزت اور ممتاز مقام حاصل کر سکے۔ اس بنا پر مسلمانوں کو اپنے مستقبل کی کسی سے بھیک نہیں مانگنی ہے بلکہ ان کا مستقبل خود ان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہیں اسے تابناک بنائیں یا حسرت انجام! اس سلسلہ میں اسلام کے فلسفۂ حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے میں نے محمود اور ایاز کا واقعہ سنایا اور کہا مسلمانو! ایاز کی طرح دنیا کی ہر چمکیلی چیز سے صرف نظر کر کے ”محمود“ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دو۔ دنیا کے خزانے خود بخود تمہارے قدموں پر آگریں گے۔ من کان للہ کان اللہ لہٗ ومن کان اللہ لہٗ کان العالم لہٗ یہ کہتے کہتے ایک مقام پر جب میں نے ذرا زور دے کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”دوستو! سیاں روٹھ گیا ہے آؤ اسے منالیں تو ساری گرہیں خود کھل جائیں گی تو میں نے دیکھا بہت سی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں“

بہر حال جلسہ ختم ہوا۔ اپنے ہوٹل میں آیا۔ چند حضرات ساتھ تھے۔ انھیں میں آندھرا پردیش کی جماعت اسلامی کے امیر مولانا سراج الحق بھی تھے جو دورہ پر آئے ہوئے تھے۔ ان سب کے ساتھ چائے نوش جان کی۔ یہ رخصت ہوئے تو ایک بجے کے قریب کمرہ میں گیا اور سو گیا۔

**میسور کے لئے روانگی** دوسرے دن یعنی ۹ر کی صبح کو نو بجے کے قریب یوسف شریف صاحب حسب قرار داد کار لے کر آ گئے۔ اصحاب ثلاثہ یعنی خالد عرفان صاحب، مشتاق احمد صاحب بہلوی اور نذیر احمد صاحب پہلے سے ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ یوسف صاحب کے ساتھ ان کی ننھی منی بچی عشرت سلمہا بھی تھی۔ نو بج کر دس منٹ پر ہم سب روانہ ہو گئے۔ میسور بنگلور سے اسّی میل کی مسافت پر ہے لیکن یہ پورا علاقہ اس درجہ حسین ودلکش ہے کہ ہر قدم پر ”چشم کو ہر رنگ میں وا“ ہو جانے کی دعوت دیتا ہے سبزہ جہاں جہاں اور لالہ چمن چمن۔ ہمہ خلخ ہمہ کشمیر۔ یہاں اگر کمی ہے تو اس چیز کی جسے اقبال نے کہا ہے:

دخترکے برہمنے لالہ رخے سمن برے
چشم بروئے اوکشا باز بخویشتن نگر

اور اس میں شک نہیں کہ یہ کمی معمولی نہیں ہے کیوں کہ ظرف حسین ہو اور ساتھ ہی مظروف بھی جاذب نظر ہو تو اس کا عالم ہی دوسرا ہوتا ہے ۔ ایک جام بلوریں میں سادہ پانی بھر کر رکھ دیجئے کوئی اسے آنکھ اٹھا کر دیکھے گا بھی نہیں اور اُس میں آتش سیال انڈیل دیجئے تو جگر کے بقول رنگ اُڑنے لگے گا ؂

دم بخود ہیں حضرت زاہد ہمیں تک دیکھ کر
ہوش اڑ جاتے اگر شیشہ سے باہر دیکھتے

لیکن میری طرح جو لوگ حسن ذاتی کے قدر دان ہوتے ہیں وہ حسن اضافی کے بغیر بھی گذارہ کر لیتے ہیں اور غالب کی طرح انھیں یہ شکوہ نہیں ہوتا کہ

بجلی اک کوند گئی آنکھ کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

راستہ میں ایک مقام پڑتا ہے "رام نگر" یہاں گھر گھر ریشم سازی کے کارخانے ہیں اور ان کے مالک زیادہ تر مسلمان ہی ہیں ۔ ایک سرکاری اسکول اس صنعت کی تعلیم و ٹریننگ کے لئے بھی ہے ۔ میری خواہش پر کار روک کر ایک صاحب جن کا نام فصیح الدین تھا ہم ان کے کارخانہ میں گھس گئے اور وہاں دیکھا کہ ہزاروں کیڑے پانی کی بڑی بڑی ناندوں میں پڑے ہوئے ہیں اور جس مشین پر کپڑا بنا جاتا ہے اُسی قسم کی مشین کے ذریعہ کیڑوں سے ریشم حاصل کر کے اسے کاتا جا رہا ہے ۔ طبیعت بہت محظوظ ہوئی اور بے ساختہ زبان سے فتبارک اللہ احسن الخالقین نکل گیا ۔ یہاں سے روانہ ہو کر ایک جگہ چائے اور اُسی کے ساتھ اس نواح کا ایک خاص قسم کا سموسہ جو چاول کے آٹے سے بنتا ہے اور واقعی بڑا لذیذ ہوتا ہے (یہاں اسے ڈوسے کہتے ہیں) کھاتے ہوئے بارہ [12] بجے کے لگ بھگ سرنگا پٹم پہنچ گئے ۔ یہ وہی مقام ہے جس کا نام زبان پر آتے ہی دل فرط عقیدت سے جھکا آنکھیں ڈبڈبا اُٹھیں اور کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا ۔

خار خار کوئے یارے ہست ہر کس را دلیست
نشگفد ہر گل کہ در پائے دلش این خار نیست (نظیری)

یہ وہ سرزمین عبرت آئین ہے جس کے ذرہ ذرہ میں غیرت اسلامی و حمیت قومی کے شرارے دفن ہیں اور اب تک ان کی گرمی محسوس ہوتی ہے ۔ یہاں پہلے مسجد اعلیٰ دیکھی ۔ ادھر اُدھر قرآن کی جو آیات کندہ ہیں اور جن میں جہاد کا حکم ہے وہ اور دوسرے کتبات پڑھے ۔ پھر مسجد اعلیٰ میں پہلے ظہر کی نماز ادا کی اور اُس کے

بعد ایک پرشکوہ گنبد میں داخل ہوئے۔ یہاں سلطان ٹیپو شہید۔ان کے والد اور والدہ کی قبریں ہیں۔ میں سلطان کی قبر پر سرہانے کی جانب بیس پچیس منٹ تک آنکھیں بند کئے بے حس و حرکت کھڑا اور فاتحہ پڑھتا رہا۔کہہ نہیں سکتا قلب پر اس وقت کیا کیفیت طاری تھی۔

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را  بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

یہ لوگ مر کر بھی کس طرح زندہ رہتے ہیں؟ وہاں خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ لیکن یہ مشاہدہ محبت کی خلش کی مانند ہے کہ محسوس تو ہوتی ہے مگر بیان نہیں کی جا سکتی۔گنبد کے ادھر ادھر کثرت سے شہزادوں۔شہزادیوں اور دیگر افراد خاندان کی قبریں ہیں۔ فاتحہ ان پر بھی پڑھی۔اس کے بعد سلطان کا قصر گرما دیکھا اس کی دیواروں پر جنگوں اور درباری زندگی کی مختلف حالتوں کی تصاویر بنی ہوئی ہیں جو ظاہر ہے انگریزوں کی ایجاد ہے اس میں وہ منظر بڑا رقت انگیز ہے جس میں سلطان کے دو بچوں کو گورنر جنرل کے بطور یرغمال حوالہ کرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یہ پینٹنگ میں نے کلکتہ میں بھی دیکھی ہے عجب کبھی دیکھی ہے غصہ کے مارے خون کھولنے لگا ہے۔ قصر کے قریب ہی ایک عظیم الشان مندر ہے جو متعصب مورخین کے برخلاف سلطان کی غایت درجہ مذہبی ناطرفداری کا روشن ثبوت ہے۔

یہاں سے روانہ ہو کر ڈیڑھ بجے کے قریب شہر میسور میں داخل ہوئے۔

اللہ! اللہ! کیا عجیب و غریب شہر ہے! ایک بلدۂ حسن و موسیقی۔ایک معمورۂ نشاط و انبساط! اسے ہندوستان کا باغوں کا شہر (Garden City) کہتے ہیں تو بجا کہتے ہیں۔ایک ریسٹوران میں لنچ کھایا۔ ظہر کی نماز ادا کی اور اس کی سیر کے لئے روانہ ہو گئے۔پہلے چڑیا گھر (Zoo) دیکھا۔ پھر آرٹ پیلیس پر ایک جھلکتی نگاہ ڈالی۔اس کے بعد ایک پہاڑی پر پہنچے جس کا نام چامنڈی ہلس (Chamandi Hills) ہے۔اس کی بلندی کوئی ساڑھے تین ہزار فٹ ہے اور شہر سے تین میل دور۔یہاں ایک نہایت عالی شان مندر ہے جو چامنڈی دیوی کی طرف منسوب ہے۔ یہ وہی دیوی ہیں جو شیوجی کی بیوی ہیں اور جنھیں شمالی ہند میں درگا دیوی کے نام سے پوجا جاتا ہے۔ انھوں نے ایک راکشس کو قتل کیا تھا جس نے قرب و جوار میں عظیم تباہی مچا رکھی تھی۔اس راکشس کا نام "مہیشا سورا" تھا۔اسی لئے اس مقام کا اصل نام

"مہیشا سورا پورا"، تھا جو بعد چل کر "میسور" بن گیا۔ چامنڈی دیوی شاہی محل کی بھی دیوی ہیں اور اس طرح اس مندر سے حکمرانوں کا خاندانی تعلق رہا ہے۔ چنانچہ دسہرہ کے تیوہار کے فوراً بعد پونم کی رات کو روشنیوں سے مزین اور آراستہ چامنڈی دیوی کا رتھ نکالا جاتا ہے جس کے جلوس میں مہاراجہ خود شریک ہوتے ہیں۔ اس وقت طوفان رنگ و نور کا عجب سماں ہوتا ہے۔ ہم نے اس مندر کو چاروں طرف سے گھوم پھر کر خوب دیکھا اور اس کے اندر جو کچھ ہے اس پر بھی ایک نگاہ ڈالی۔ میں پہاڑ کا عاشق ہوں۔ ہندوستان کا کوئی ہی پہاڑ ہو گا جہاں میں نہ گیا ہوں۔ یہاں بھی وہی نشیب و فراز اور پیچ و خم ملے تو طبیعت بڑی محظوظ ہوئی:

کم نہیں نازش ہمنامیٔ چشم خوباں تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

مندر کے پہلو میں ایک گائے کا نہایت عظیم الشان مجسمہ ہے جس میں صنعت کار نے کمال یہ دکھایا ہے کہ پورا مجسمہ صرف ایک چٹان کی تراش خراش سے تیار کیا گیا ہے۔ اس کو بھی دیکھا۔ واقعی فن کاری کی انتہا ہے یہاں مہاراجہ کا ایک محل بھی ہے۔ اسے دور سے ہی دیکھتے ہوئے نیچے اترے۔ شہر کے سب سے زیادہ بارونق حصہ میں پہنچ کر بازار دیکھے۔ ایک رستوران میں چائے پی۔ عصر کی نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔ اس لئے قریب ہی ایک بڑی مسجد تھی اس میں عصر کی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد مغرب کی نماز جماعت سے ادا کی۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جماعت میں مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔

اب اس وقت مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ فضا بڑی خوش گوار تھی اور ہماری کار اڑی چلی جا رہی تھی۔ بارہ ۱۲ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم لوگ برنداون گارڈن (Brindavan Garden.) پہنچے۔ یہ گارڈن کرشنا راج ساگر ڈیم سے متصل اور بالکل اس کے پہلو میں ہے۔ یہ ڈیم (بند) پونے دو میل لمبا ہے اور اس کے پانی سے کوئی سوا دو لاکھ ایکڑ زمین کی آب پاشی کی جاتی ہے۔ اس بند کی بنیاد سلطان ٹیپو شہید نے ۱۲۲۱ھ میں ایک ساعت نیک و سعید میں ڈالی تھی۔ بند کے داخلہ پر ایک سنگین کتبہ ہے اس میں بزبان فارسی اس کا حوالہ تفصیل سے کندہ ہے۔

اندھیرے کے باعث اس بند کو تو اچھی طرح نہیں دیکھا جا سکا لیکن اس کے پہلو میں ہی جو گارڈن ہے

اُس سے جی بھر کر لطف اندوزی کی۔ سبحان اللہ! کیا باغ ہے۔ قسم قسم کی روشنیوں کے باعث جو آبشار میں اور روش کے دونوں جانب اور ادھر ادھر باغ کے قطعات میں لگائی گئی تھیں ایک عجب عالم رنگ و نور تھا۔ بیچ بیچ میں جو فوارے تھے اُن میں بھی مختلف رنگوں کی روشنی اس اہتمام و انتظام سے پیوست کی گئی تھی کہ فوارہ سے رنگین پھوارین نکلتی تھیں گویا قوس قزح محلول ہو کر برسنے لگی ہے یا جل پریوں نے قبائے طاؤسی زیب تن کر کے رقص شروع کر دیا ہے۔ عجب پر کیف و نشاط آفریں منظر تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حافظ کی غزلوں اور خیام کی رباعیات نے مجسم ہو کر فضا کو ہمہ نغمہ و شعر اور یک پیکر نزہت و لطافت بنا دیا ہے۔

عزیز سیٹھ صاحب کے ہاں طعام شب | طلسمات رنگ و نور کا یہ عالم یہاں روزانہ ڈیڑھ دو گھنٹہ رہتا ہے آٹھ بجے کے قریب جب اس کے اختتام کا وقت قریب آیا تو ہم لوگ یہاں سے روانہ ہو کر عزیز سیٹھ کے مکان پر آئے۔ موصوف اس علاقہ کے دیرینہ اور بلند مرتبہ قومی کارکن ہیں اور ایم۔ ال۔ اے بھی ہیں۔ یوسف شریف صاحب نے پہلے سے ان کو میرے میسور پہنچنے کی اطلاع کر دی تھی اور انھوں نے طعام شب کا اہتمام کرنے کے ساتھ میسور کے چند ذی علم حضرات کو مجھ سے ملنے اور گفتگو کرنے کے لئے مدعو کر لیا تھا۔ چنانچہ تو سوا نو بجے کے قریب عزیز سیٹھ صاحب کے مکان پر ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ متعدد حضرات تشریف لے آئے۔ ان میں صرف محب مکرم جناب مبارز الدین رفعت صاحب شعبۂ اُردو مہارانی کالج سے بواسطۂ برہان غائبانہ تعارف تھا۔ اب ان سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ان کے علاوہ جن حضرات کے نام یاد رہ گئے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ جناب علی جان صاحب شعبۂ عربی مہارانی کالج

۲۔ جناب سلیم تمنائی صاحب مشہور افسانہ نگار

۳۔ جناب یوسف سیٹھ صاحب شعبۂ انگریزی فلومنا کالج

۴۔ جناب ہڈ ماسٹر صاحب فاروقیہ ہائی سکول۔ ان کے علاوہ جو اور حضرات تھے اور وہ غالباً طبقۂ تجار سے اور اسلامی و تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ سخت افسوس ہے کہ ان کے نام

یاد نہیں رہے" معذرت خواہ ہوں" بہرحال بڑا سنجیدہ - مہذب اور شائستہ مجمع تھا - اب گفتگو شروع ہوئی ــــ اور موضوع وہی مسلمانوں کے مسائل و معاملات ـــ تو ساڑھے دس بج گئے - بولنا زیادہ مجھے ہی پڑا - پورا دن اسی طرح ایک منٹ کے لئے کرسیدھی کئے بغیر نقل و حرکت میں گذر گیا تھا اور ابھی بنگلور واپس ہونا بھی تھا اس لئے میں نے بادل نخواستہ ان حضرات سے اجازت لی اور اب ہم میسور کی گل ریز و عطر بیز فضاؤں اور ہواؤں کو الوداع کہتے ہوئے واپس روانہ ہو گئے - ڈیڑھ بجے کے قریب بنگلور پہنچے - احباب کو شب بخیر کہہ کر میں ہوٹل کے اپنے کمرہ میں آیا - عشاء کی نماز نہیں پڑھی تھی - وہ پڑھی اور خواب کی دنیا میں غائب ہو گیا -

معلوم نہیں کس طرح میرے دماغ پر یہ خیال مسلط ہو گیا تھا کہ میرا جہاز مدراس کے لئے ۱۰ ستمبر کو ظہر کے بعد روانہ ہوگا - چنانچہ اسی کا تذکرہ میں نے احباب سے کیا تھا اور اسی کے مطابق انھوں نے اس تاریخ میں دن بھر کے لئے بنگلور میں میری مصروفیات کا ایک پروگرام بنا لیا تھا اور اسی مفروضہ کی بنیاد پر میسور سے واپسی کے بعد شب میں اپنے اصحاب اربعہ سے جدا ہوا تو اس قرار داد کے ساتھ کہ صبح نو بجے یہ حضرات پہنچ جائیں گے - لیکن خدا کی شان دیکھئے - صبح میں ضروریات و مشاغل صبح گاہی سے فارغ ہو کر صوفہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک خیال آیا کہ ذرا ٹکٹ تو دیکھ لوں - اب ٹکٹ جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ جہاز ظہر کے بعد نہیں بلکہ ابھی ۴۵ - ۷ پر جا رہا ہے اور اس وقت گھڑی میں سات بجے تھے - پھر یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہوائی اڈہ یہاں سے کتنی دور ہے بس ہاتوں کے طوطے اڑ گئے - پیشانی پر پسینہ آ گیا -

مدراس کے لئے روانگی | بہرحال اللہ کا نام لے کر اٹھا - جلدی جلدی سامان پیک کیا - ہوٹل کا بل ادا کر کے ملازم کو سامان دیا اور باہر آیا - سامنے ہی ایک ٹیکسی کھڑی تھی - ڈرائیور سمجھ گیا کہ وقت کم رہ گیا ہے اور میں گھبرایا ہوا ہوں - اس لئے اُس نے واجبی کرایہ سے دُگنا تگنا کرایہ مانگا - میں نے فوراً ہاں کر لی - اُس نے کرایہ تو منہ مانگا لیا لیکن حق ادا کر دیا - اس قدر تیز لایا کہ جہاز کی روانگی سے پندرہ منٹ پہلے پہنچا دیا جہاز تو خیر مل گیا لیکن اُس سے جتنی خوشی ہوئی اُس سے کہیں زیادہ افسوس اور قلق اس بات کا ہوا کہ روانگی کے وقت اصحاب اربعہ یعنی یوسف شریف صاحب - خالد عرفان صاحب - مشتاق احمد اور نذیر احمد صاحبان سے

ملاقات نہ ہوسکی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یوسف صاحب کار نہ لاتے اور اپنے اپنے دفتروں سے رخصت لے کر یہ سب صاحبان ساتھ نہ ہوتے تو میں بنگلور۔ سرنگا پٹم۔ اور میسور کا اس درجہ کامیاب سفر اور اس قدر راحت و آرام کے ساتھ ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ سب احباب اس درجہ مہذب۔ شائستہ۔ خوش ذوق اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں کہ ان کی معیت میں ہم مذاقی کا لطف و سرور بھی حاصل رہا۔ میں ان حضرات کی مخلصانہ محبت و عنایت کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔ اُس دن سنٹرل مسلم ایسوسی ایشن میں میرا استقبالیہ (Reception) تھا۔ میرے چانک روانہ ہوجانے سے ان حضرات کو مایوسی ہوئی اور سارا پروگرام درہم برہم ہوگیا۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

مدراس میں قیام | جہاز مقررہ وقت کے مطابق ٹھیک سات بج کر پنتالیس منٹ پر اڑا اور آٹھ بج کر پینتیس منٹ پر مدراس پہنچا دیا۔ مدراس میں احباب کی اچھی تعداد ہے لیکن میری عادت یہ ہے کہ اس قسم کے سفر کے موقع پر کسی کو خبر تک نہیں کرتا اور کسی دوست کا مہمان بننے کے بجائے ایک صاف ستھرے ہوٹل میں قیام کرنے کو پسند کرتا ہوں۔ اسی میں میں آزاد بھی رہتا ہوں اور ہر طرح کی راحت بھی ملتی ہے۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی یہی کیا ایرپورٹ پر اتر کر مدراس کے مرکزی مقام ماؤنٹ روڈ آیا اور ایک ہوٹل جس کا نام امبیسیڈر ہے (Ambassador) اُس میں اپنی پسند کا ایک کمرہ لے کر فروکش ہوگیا۔ دس بجے کے قریب بشیر احمد سعید صاحب (سابق جج مدراس ہائیکورٹ) جو میرے دیرینہ کرم فرما اور بزرگ ہیں اور علمی و فنی مہارت کے ساتھ اخلاص و جوش عمل کی وجہ سے جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے ان کو فون کیا۔ ان کو پہلے سے کسی اطلاع کے بغیر میرے اچانک پہنچ جانے پر بڑا اچنبھا ہوا۔ بہرحال فون پر قرارداد کے مطابق شام کو پانچ بجے اُن کے مکان پر پہنچا۔ وہ اور بیگم صاحبہ دونوں کے ساتھ چائے پی۔ یہیں انھوں نے ایک زنانہ کالج میں تقریر کی فرمائش کی۔ مجھ سے انکار نہ ہوسکا۔ چائے سے فراغت کے بعد وہ مجھے اپنی کار میں لے کر روانہ ہوتے۔ پہلے افضل العلماء مولانا محمد یوسف صاحب کوکن عمری صدر شعبۂ عربی و فارسی مدراس یونیورسٹی کے مکان پر پہنچے۔ موصوف میرے دیرینہ اور عزیز دوست ہیں۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو دنگ رہ گئے اور شیروانی پہن فوراً ساتھ ہوگئے۔ اب ہم تینوں نے سمندر کے کنارے کنارے پورے علاقہ کا چکر لگایا

بشیر احمد سعید صاحب بتاتے جاتے تھے کہ یہ فلاں بلڈنگ ہے۔ فلاں مقام ہے۔ یہ نوابان ارکاٹ کے محلات ہیں جن میں اب یہ دفتر ہے وہ دفتر ہے مدراس یونیورسٹی کے فلاں فلاں شعبے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے کار سے اُتر کر ساحل پر بھی چہل قدمی کی۔ بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ مغرب کے بعد مجھے اور مولانا محمد یوسف صاحب کوکن کو میرے ہوٹل میں اتار کر بشیر احمد سعید صاحب گھر روانہ ہو گئے: مولانا موصوف جنوبی ہند اور خصوصاً مدراس کی اسلامی تاریخ کے بڑے فاضل اور محقق عالم ہیں۔ انگریزی۔ عربی اور اُردو تینوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور متعدد ضخیم کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ اب وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر چلے۔ ہوٹل سے تھوڑے ہی فاصلہ پر مشہور تاریخی مسجد والاجاہی تھی وہاں پہنچے۔ اس مسجد کے ساتھ ایک قبرستان بھی ہے جس میں مولانا بحر العلوم کے ساتھ اکابر علماء مشائخ اور نواب مدفون ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق بھی یہیں ہیں۔ ان مزارات پر فاتحہ پڑھی۔ پھر مسجد کے اندر داخل ہو کر اُس کی عمارت پر ایک نگاہ ڈالی اور کتبات پڑھے۔ محراب پر جو قطعۂ تاریخ کندہ ہے اور جس میں "نام فرخندہ وے مسجد والاجاہی" سے اس کی تاریخ تعمیر ۱۲۱۰ھ نکلتی ہے اُس کے متعلق یہ بات دلچسپی سے سنی جائے گی کہ اس قطعہ کا مصنف ایک ہندو شاعر ہے جس کا نام مکھن لال تھا بہادر خطاب اور خرد تخلص رکھتا تھا۔ یہاں مسجد میں ہی کوکن صاحب نے فرمایا وہ مدراس میں آپ کے قدردان اور مداح بڑی تعداد میں ہیں۔ آپ کے چلے جانے کے بعد ان کو اطلاع ہوئی تو انھیں مجھ سے سخت شکایت ہوگی کہ میں نے خبر کیوں نہ کی"۔ میں نے عرض کیا "نفس ملاقات تو باعث مسرت ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ جو ملتا ہے تقریر کی فرمائش کرتا ہے اور میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ اس لئے آپ کسی کو اطلاع نہ کریں"۔ کوکن صاحب بڑے جز بز ہوئے لیکن آخر کار میری مجبوری کے پیش نظر انھوں نے وعدہ کیا اور اس کو اس طرح نباہا کہ راہ چلتے اگر کوئی صاحب ملے اور انھوں نے میرے متعلق دریافت فرمایا بھی تو وہ گول مول بات کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

**کتاب خانہ دیوان صاحب کا باغ** دوسرے دن یعنی ۱۱ ستمبر کو صبح نو بجے حسب قرارداد مولانا محمد یوسف کوکن ہوٹل پہنچ گئے اور ہم دونوں کتاب خانہ دیوان صاحب کا باغ پہنچے۔ دراصل جنوبی ہند میں مولوی محمد غوث شرف الملک بہادر المتوفی ۱۲۳۸ھ کا خاندان علم و فضل۔ شرافت اور دینداری میں بہت ممتاز اور مشہور چلا آرہا ہے ان کے

مورثِ اعلیٰ نویں صدی ہجری کے ایک بزرگ فقیہ عطا احمد شافعی تھے۔ اس خاندان کی خصوصیت یہ ہے کہ شروع سے اب تک مسلسل دین اور علم کی خدمت انجام دیتا چلا آرہا ہے اور اس میں اکابر علماء مصنفین و مشائخ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ آج بھی ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیرس) ڈاکٹر یوسف الدین (حیدر آباد) اور ڈاکٹر محمد غوث (مدراس) اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ حیدر آباد کا مشہور کتب خانہ سعیدیہ اسی خاندان کے افراد کا اندوختہ ہے اور اسی طرح مدراس کا یہ کتب خانہ جو درحقیقت مختلف افراد خاندان کے الگ الگ چند ذاتی کتب خانوں کا مجموعہ ہے اس خاندان کا لائق صد ہزار نازش و فخر سرمایۂ حیات ہے۔ یہ کتب خانہ کیا ہے؟ عجیب و غریب نوادر مخطوطات اور نایاب مطبوعہ کتب۔ شاہی فرامین و دستاویزات۔ بیجاپور کے عادل شاہی اور مدراس کے والاجاہی عہد کے خاندانی اور دفتری خطوط و مراسلات ریکارڈس۔ بیاضوں۔ روزنامچوں۔ اور ان کے علاوہ خطاطی کے بہترین نمونوں۔ الواح۔ سکے۔ برتن۔ مہریں اور کپڑے وغیرہ ان سب چیزوں سے بھرا ہوا ہے۔ حالیہ شمار کے مطابق اس وقت ان کتب خانوں میں ۲۹۴۷۱ (انتیس ہزار چار سو اکہتر) کتابیں ہیں جن میں سے دس ہزار سات سو پچاس قلمی ہیں بعض مخطوطات اور بعض تحریریں ایسی ہیں جو بے شبہ دنیا میں کسی اور جگہ نہیں ملیں گی۔ لیکن سخت افسوس اور بڑے شرم کی بات ہے کہ علم و فن کا یہ گنجینۂ نایاب ناقدری کے ہاتھوں پامال خزاں ہو رہا ہے۔ یہ سب نوادر جا بجا بے ترتیب بستوں۔ ٹرنکوں صندوقوں اور الماریوں میں لشتم پشتم بھرے ہوئے ہیں۔ غربت کی وجہ سے ان کتب خانوں کے مالک ان کی خاطر خواہ دیکھ بھال و نگرانی کر نہیں سکتے اور نہ مسلمانوں کو اس طرف توجہ ہے اور نہ حکومت کو، ایک لے دے کے ڈاکٹر محمد غوث ہیں جو شب و روز ان کی تنظیم و ترتیب میں لگے ہوئے ہیں لیکن کثیر سرمایہ کے بغیر کیا ہو سکتا ہے؟ ضرورت ہے کہ سالار جنگ میوزیم کی طرح اس کی حفاظت اور تنظیم و ترتیب کا سر و سامان ہو۔

وقت کی تنگی کے باوجود میں نے اس کتب خانہ میں مسلسل چار گھنٹے صرف کئے۔ ڈاکٹر محمد غوث صاحب بڑی محبت اور توجہ کے ساتھ خاص خاص چیزیں نکال نکال کر دکھاتے جاتے تھے اور میں اپنے ذوق کی خاص اور نایاب چیزوں کی یادداشت اپنی بیاض میں لکھتا جاتا تھا۔ مولانا محمد یوسف کوکن اس مہم میں برابر میرے شریک اور معاون رہے۔ ناظرین کی ضیافت کے لئے بعض نوادر کا ذکر کرتا ہوں:-